محمد الیاس خان

وسطی ایشیا - ترکی تعلقات

[زیرِ نظر مقالے میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد وسطی ایشیا اور قفقاز میں ترک سرگرمیوں کے تصوراتی لائحہ عمل [conceptual frame-work] اور نظریاتی اساس [ideological underpinning] کو موضوع بحث بنایا گیا ہے. خطّے میں ترک اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کے حجم اور اس سے متعلق اعداد و شمار کا احاطہ کرنا اس مقالے کے مقاصد میں شامل نہیں ہے. مدیر]

۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت اشتراکی بلاک میں ٹوٹ پھوٹ کے آثار نے ترک پالیسی سازوں کو ایک گونہ بے چینی اور اضطراب سے دوچار کیا۔ وارسا پیکٹ کے خاتمے کے نتیجے میں یورپ و امریکہ کے "مشترکہ دشمن" کے منظرِ عام سے غائب ہونے کے بعد ترک خارجہ اور دفاعی امور کے ماہرین یہ سمجھنے لگے تھے کہ مستقبل میں مغرب کے لیے ترکی کی "جیوسٹرٹیجک" اہمیت کم ہوجائے گی۔ چنانچہ عام طور پر سرد جنگ کے دوران کار فرما دو قطبی عالمی نظام کے خاتمے کو ترکی کے مستقبل کے لیے ایک برا شگون سمجھا گیا[1]۔

نئی جمہوریہ ترکی کی بنیاد پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ۱۹۲۳ء میں رکھی گئی۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو جمہوریہ ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے رسمی طور پر خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا[2]۔ کمال اتاترک نے ترکی کو مغربی خطوط پر ایک جدید جمہوریہ میں بدلنے کے لیے ترک مسلمانوں کو اپنی چھ سو سالہ تاریخ سے کاٹ دیا۔ اگرچہ عالم اتراک وسطی ایشیا، قفقاز اور مشرقی یورپ کے وسیع و عریض خطوں پر مشتمل تھا، جدید ترکی کی حدود میں محض ایشیائے کوچک کے ان علاقوں کو شامل کیا گیا جن پر عملاً ترک فوجوں کو کنٹرول حاصل ہوگیا تھا۔ اتاترک نے جدید ترکی کو "ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے" سیکولرازم کو ریاست کی سرکاری آئیڈیالوجی قرار دیا۔ خلافت کے مرکزی نظام کی بجائے ترکی کو مغربی طرز

کی علاقائی قومی ریاست (territorial nation state) قرار دیا گیا۔ چنانچہ ریاست کے تمام اداروں کی تشکیل اسی نظریے کی نگرانی اور رہنمائی میں کی گئی۔ بہر حال اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کی یہ سوچ شکست خوردگی کی غماز تھی۔ اور ترک مسلم عوام کے ملی اور مذہبی جذبات کی ترجمانی پر مبنی نہیں تھی۔ ترک عوام اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس حقیقت پر جدید ترکی کی تقریباً بہتر سالہ تاریخ گواہ ہے۔ سیکولرازم کی آہنی گرفت کے باوجود وہاں کے مسلم عوام کا رشتہ ان کے ماضی اور اسلامی اقدار سے توڑا نہیں جا سکا ہے۔ ملک میں تحریک احیاء اسلام زوروں پر ہے۔ اور اسلام پسند سیاسی عناصر کو زبردست عوامی تائید حاصل ہو رہی ہے۔

ترک عوام کو اپنی چھ سو سالہ ماضی کی شاندار روایات سے کاٹنے کے لیے ترک رسم الخط کو عربی کی بجائے لاطینی میں بدل دیا گیا۔ مغرب پرستی میں جدید ترکی کو "علاقائی قومی ریاست" تو قرار دے دیا گیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مذہبی حوالوں سے ترک عوام کا تعلق ان کے اصل مسکن سے کس طرح کاٹا جائے؟ وسطی ایشیاء قفقاز اور مشرقی یورپ کے دیگر علاقوں میں موجود ترکوں کے ساتھ صدیوں کے مذہبی، سماجی اور سیاسی روابط کو کس طرح جدید ترکی کے عوام کے ذہن سے محو کیا جائے؟ ایک دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ترکی کے زیر قبضہ موجودہ علاقے (اناطولیہ) کی تاریخ سلجوق سلاطین اور عثمانی خلافت کے اسلامی ادوار سے عبارت تھی۔ جدید سیکولر ترکی اور کمال اتاترک کے سیکولر نیشنلزم کو "علاقائی قومی ریاست" کے مغربی تصوّر سے ہم آہنگ کرنے اور ترکی کے موجودہ علاقے کو ریاست کی علاقائی حدود مقرر کرنے کے لیے تاریخی استناد [historicity] کی ضرورت تھی۔ اور یہ تاریخی استناد ایک "سیکولر ریپبلکن شناخت" اور سلجوق اور عثمانی عہدوں کے اسلامی ورثہ میں تضاد کا حامل تھا۔ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے اور ریاست کی مغربی لادین تصورات پر تشکیل کے عمل کو مضبوط کرنے کے لیے تاریخ نویسی کا نیا انداز اپنایا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ترک تہذیب و ثقافت کو اس کے اسلامی عنصر سے پاک کرنے کا اہتمام کیا جائے اور ترک عوام کا ان کے اسلامی ورثے اور مزید یہ کہ جدید ترکی سے باہر ترکوں کے اصل علاقوں میں موجود ترک مسلم عوام سے ان کے مذہبی تعلق کے رشتوں کو منقطع کر دیا جائے۔ بوگازیچی یونیورسٹی استانبول کے دیدم مرسیم ایچی اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> "Durnig the first years of the republic, as part of the Kamalist ideology the task of writing the national history was regarded as a political mission."[3]

ان مقاصد کے حصول کے لیے اتاترک کی ذاتی نگرانی میں ۱۹۳۰ء میں ایک سپیشل کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کا کام ترک مسکن [Turkish hearth] اور ترک تاریخ پر تحقیقات کرنا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں اس کمیشن کے خاتمہ کا اعلان کر کے اس کی بجائے Turkish Historical تھی۔ اس کا

نام بعد میں اتاترک نے Turkish History Academy میں بدل دیا۔ اس Research Society کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ یہ سوسائٹی کمال اتاترک کی ذاتی نگرانی میں کام کرتی اکیڈمی کا بنیادی کام ترک سکولوں کے طالب علموں کے لیے ترکی کے ریاستی نظریے سے مطابقت پر مبنی تاریخ کی کتابوں کی تیاری تھی۔ چنانچہ:

> "The fundamental purpose of the association [the society] was to do research on Turkish history and publish its findings. Thus, its first project was the preparation of a four-volume series of history books to be taught at high schools. The history textbooks for primary and secondary schools were in turn based on this series"[4]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تاریخ نویسی کے اس کام میں اس بات کا نہایت اہتمام سے خیال رکھا گیا کہ جدید ترکی کے عوام کا مسلم امہ سے تعلق جڑوں سے کاٹ دیا جائے۔ چنانچہ وسطی ایشیا اور قفقاز کے مسلم ترکوں کے ساتھ ترکی کے عوام کے نسلی اور ثقافتی تعلق کو تو اگرچہ اجاگر کیا گیا اور اس کی بنیاد پر [Turkish nation] کی historicity کو ثابت کیا گیا لیکن اس عمل میں مذہبی حوالوں اور مشترکہ اسلامی روایات کو یکسر نظرانداز کیا گیا۔ چنانچہ بقول دیدم مرسلیم ایچی:

> "In the attempt to create a 'civic territorial nation', Ataturk made use of geneology, vernacular languages, customs and traditions, myths of an Historic homeland and an historic language in order to secure popular mobilization in 'reawakening' [the Turkish people] from a long slumber to take its place in a world of nations".[5]

یوں ایک طرف ترکوں کی شاندار ماضی [glorious historic past] کا امین تو وسطی ایشیا کو قرار دیا گیا۔ دوسری طرف جدید ترکی میں صرف اس علاقے کو شامل کیا جا سکا جو ترکوں کے اسلاف کے اسلامی ماضی [Islamic past] اور شاندار مذہبی روایات کا گہوارہ تھا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو کمال اتاترک اور اس کے ساتھیوں کے لیے مسلسل پریشانی کا باعث تھا۔ اس بنیادی مسئلے پر قابو پانے کے لیے بھی ترکوں کی تاریخ کو سرکاری طور پر مسخ کرنے کی کوشش کی گئی:

> The dilemma was resolved by a new approach to history. Thanks to the close interest of Ataturk and with the contribution of certain earlier Europeon Turkologists, a thesis on Turkish history was

proposed. It claimed the basis of all civilizations to be the Turkic civilization, created by Turks who had to migrate from Central Asia, their homeland, to all parts of the world. This provided the Anatolian Turkish population with ethnicity and historicity and a new 'cultural self-defination'."[6]

تاریخ کی اس طرح کی تشریح کا واضح مقصد یہ تھا کہ جدید ترکی کے عوام کے وسط ایشیائی ترک مسلم عوام کے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کی اہمیت کو کم سے کم کیا جائے۔ کیونکہ اس طرح کی تشریح کا لازمی مطلب یہ تھا کہ وسطی ایشیائی ترک مسلم عوام کے ساتھ ان تہذیبی رشتوں میں انہیں کوئی انفرادی مقام حاصل نہیں ہے۔ بلکہ وسط ایشیاء دنیا کی تمام تہذیبوں (بشمول مغربی تہذیب) کا واحد مہد [cradle] ہے۔ یوں لگتا ہے کمال اتاترک اور ان کے ساتھی جہاں وسط ایشیائی ترک مسلم عوام کے ساتھ اناطولیہ کے ترکوں کے نسلی روابط سے انکار کے متحمل نہیں تھے وہاں انہوں نے پوری کوشش کی کہ اناطولیہ کے ترکوں کے وسط ایشیائی مسلم عوام کے ساتھ [سیکولر معنوں میں بھی] تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کو pan Turkism کی بنیاد بننے سے روکنے کی ہر تدبیر کی جائے۔ کیونکہ pan Turkism پر مبنی احساسات بھی بہرحال ترکوں کی مشترک مذہبی روایات کے باعث pan Islamism کے جذبات کو تقویت دینے کا باعث بن سکتے تھے۔ جو کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک جدید ترکی کو سیکولر مغربی ریاست بنانے، لادین قومیت سازی [secular nation-building] اور موڈرنائزیشن [تجدید] کے عمل کو سبوتاژ کرنے کا باعث بن سکتے تھے۔ کمال اتاترک کا واضح مقصد ایک ایسی ریاست کی تشکیل تھا جو "ہزار سالہ مشرق - مغرب تصادم اور عیسائی - مسلم کشمکش" کو ختم کر کے مغرب اور اس کی تہذیبی برتری کے اعتراف کی آئینہ دار ہو۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد نوآزاد وسط ایشیائی ریاستوں کی طرف سے ترکی کا سیکولر نظام ریاست اختیار کرنے کے عمل کو یورپ کی ضرورت قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہا گیا:

The adoptation of the Turkish model by the TSCCA [Turkic speaking countries of Central Asia] is important for Europe also in softening the old but still growing polarization of the world on Christian-Muslim lines which is a source of nationalist abberation and military conflicts. It is often an over looked fact that the formation of a Turkish nation-state on the western European model was a completely new phenomenon. It had fundamentally changed the persistent

themes of the millennium-old East-West and Christian-Muslim conflict".

مسلم دنیا کے ساتھ بالعموم اور بیرونی دنیا کے ترک ہم نسلوں کے ساتھ بالخصوص تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کی اہمیت کم کرنے بلکہ نظر انداز کرنے کے بین السطور جدید ترکی کے بانیوں کے اس عزم کا اظہار تھا کہ وہ مستقبل میں اپنے ترک ہم نسلوں اور دیگر ہم مذہب مسلم اقوام کے مسائل سے سروکار نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنا مستقبل مغرب سے وابستہ کر چکے ہیں۔ اور اپنے تمام مسائل کا حل "مغرب سے مکمل وابستگی" کے فریم ورک میں تلاش کریں گے۔

اس سارے مقدمے کو پیش نظر رکھ کر اگر ماضی میں ترکی - سوویت یونین تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سرد جنگ کے دوران انقرہ کی توجہ سوویت یونین کے ساتھ "Moscow centred" تعلقات پر مرکوز رہی ہے۔ انقرہ نے سوویت یونین میں شامل ترک جمہوریاؤں کے داخلی مسائل اور وہاں کی روس مخالف عوامی تحریکوں میں کبھی بھی کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ گورباچوف عہد میں گلاسناسٹ اور پیروسٹرائکا پالیسیوں کے نتیجے میں جب مقفل سوویت نظام کی گرہیں کھلنے لگیں اور بظاہر بیرونی دنیا کے لیے سوویت جمہوریاؤں کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر تعلقات قائم کرنے کے مواقع پیدا ہونے لگے تب بھی انقرہ کی حکومت مضبوطی سے اس پالیسی پر قائم رہی کہ کوئی بھی ایسا عندیہ نہ دیا جائے جس سے یہ فرض کیا جاسکتا ہو کہ ترکی سوویت نظام کی شکست و ریخت یا کم از کم یونین جمہوریاؤں پر ماسکو کی گرفت کمزور پڑنے کا متمنی ہے[8]۔

۱۹۹۰ء میں جب ترکی کے صدر ترگت اوزال سے سوویت آذر بائیجان میں برپا فسادات کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ترکی صرف اور صرف اپنے داخلی مسائل میں دلچسپی رکھتا ہے۔ آذر بائیجان کا تنازعہ - سوویت یونین کا داخلی معاملہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا "ترکی سوویت یونین میں شامل ترک جمہوریاؤں پر مشتمل ایک ترک سلطنت 'Turkish empire' کی تعمیر کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ ترکی بانئ ریاست اتاترک کی اس پالیسی پر ہمیشہ گامزن رہے گا کہ بیرونی تنازعات میں قطعاً مداخلت نہ کی جائے[9]۔" دوسری طرف سوویت یونین میں تبدیلیاں اس تیزی سے ظہور پذیر ہونے لگیں کہ ترک پالیسی سازوں کے لیے ان کا ساتھ دینا ممکن نہیں رہا۔ ۱۹۹۱ء کے اواخر میں نئی یونین ٹریٹی پر دستخطوں کے حصول میں ناکامی کے بعد جب سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے لگا اور سوویت جمہوریائیں ایک ایک کر کے آزادی اور استقلال کا اعلان کرنے لگیں تب بھی ایک مختصر عرصہ کے لیے ترک پالیسی ساز "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر کاربند رہے۔ دراصل شروع میں ترکی کے لیے سوویت یونین کا بطور سپر پاور خاتمہ نیک شگون خیال نہیں کیا گیا۔ ترک پالیسی سازان خدشات کا شکار تھے کہ ترکی کے مغربی حلفاء کے لیے اس کی تزویراتی اور جغرافیائی - سیاسی [geopolitical]

اہمیت کم ہو جائے گی "[10]۔ ترک پالیسی سازوں کے اِن خدشات کی وضاحت کے لیے جنگ عظیم دوم کے بعد ترکی کے خارجہ تعلقات کی تاریخ اور انقرہ کی طرف سے اختیار کردہ قومی سلامتی، دفاع اور اقتصادی ترقی کے حصول کی پالیسیوں کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

جنگ عظیم دوم کے اختتام پر ترکی کو سوویت یونین کی روایتی توسیع پسندانہ جارحیت کے خطرات کا سامنا تھا۔ ۲۰ کی دہائی میں سوویت یونین اور ترکی کے مابین معاہدہ دوستی طے پانے اور ۳۰ء کی دہائی میں دونوں ممالک کے درمیان نزدیکی اقتصادی روابط کے باوجود ترکی کو سوویت یونین کی طرف سے حقیقی خطرات درپیش تھے۔ ۱۹۴۵ء میں سوویت یونین نے ترکی کے شمال مشرقی صوبوں کے بعض علاقوں کو سوویت علاقے قرار دے کر انقرہ کو ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ ماسکو نے آبنائے باسفورس اور دردانیال پر ترک بالادستی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے ان پر ترک - سوویت مشترکہ کنٹرول کا مطالبہ بھی کیا[11]۔ ان حالات میں ترکی نے ۱۹۴۸ء میں ریڈ آرمی سے درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹرومین تصوّرِ سلامتی[Truman Doctrine] اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور آخر کار ۱۹۵۲ء میں ناٹو کے دفاعی حصار میں شامل ہو گیا۔ درحقیقت خود مغرب کی دفاعی ترجیحات نے ترکی کی ناٹو میں شمولیت کی راہ ہموار کی۔ ترکی کو ناٹو کی دفاعی حکمت عملی میں سوویت یونین کی خلیج اور [Meditterranean] کی طرف پیش قدمی کو روکنے کے لیے جنوب مشرقی قلعے کی حیثیت حاصل ہو گئی"[12]۔ یونان کے ساتھ تنازعہ قبرص اور ۱۹۷۰ء میں امریکہ کی طرف سے ترکی کو اسلحہ کی سپلائی پر پابندی لگانے کے باوجود ترکی کی دفاعی اور ملکی سلامتی سے متعلق پالیسیاں سرد جنگ کے پورے دورانیے میں کمیونسٹ مخالف مغربی اتحاد کے ساتھ مکمل وابستگی کا مظہر رہیں۔ تاہم اس کے باوجود ترکی بین الاقوامی سیاست میں کوئی نمایاں کردار ادا کرنے میں ناکام رہا"[13]۔

ناٹو میں شمولیت نے اگرچہ ترکی کی دفاعی پوزیشن مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ملک کی اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کے سلسلے میں ناٹو سے وابستہ ترکی کی توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ مغربی حلفاء کے لیے ترکی کی "جیوسٹرٹیجک" اہمیت مسلّم تھی تاہم ان کے نزدیک ترکی کی اس اہمیت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کی اقتصادی مشکلات حل کرنے کا بوجھ مغربی حلفاء برداشت کریں۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جو ترک پالیسی سازوں کے لیے ہمیشہ سے باعثِ پریشانی رہی۔ انقرہ بجا طور پر یہ سمجھنے لگا کہ مغرب کے ساتھ مکمل وابستگی کے لیے اس کی "ہمہ جہتی اور پرخلوص کوششوں" کے باوجود مغربی حلفاء کے لیے اس کی اہمیت صرف ان حالات تک محدود تھی جب خود مغرب کی سلامتی کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ترکی کو عملی کردار ادا کرنا ہو"[14]۔ عالم اسلام سے اپنا تعلق توڑ کر مغرب کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرتے وقت جدید ترکی کے بانیوں کی توقعات یہ تھیں کہ ایسا کرنے سے نہ صرف ترکی کی اقتصادی مشکلات حل کرنے میں مدد ملے گی بلکہ ترکی سیاسی، سماجی اور دفاعی شعبوں میں ایک ترقی

یافتہ اور طاقتور ملک بن کر ابھرے گا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اسے مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کی ہمسری کا موقع ملے گا۔ اور جلد ہی ترکی مغربی یورپ کی خوشحال، صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ اور مستحکم جمہوری ممالک کی صف میں شامل ہوجائے گا:

> Turkey's close cooperation with the west was not only designed to serve security and economic policy considerations, but was also an indispensable component of the process of Westernization which was initiated 'over 150 years ago' and which was intensified after the republic was founded in 1923. This process sought to strengthen the bonds with Western civilization. At the same time, it was hoped that this would overcome economic, technological and social backwardness and help introduce or extend basic democratic and human rights in the country along Western lines."[15.]

اس پس منظر میں جب سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں ناٹو کے مشترکہ دشمن کا خاتمہ ہوا اور بدلتے ہوئے عالمی حالات میں ناٹو کے relevence اور اس کی نئی ذمہ داریوں پر بحث کا آغاز ہوا تو انقرہ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ ترک پالیسی سازوں نے بجا طور پر انقرہ کو ایک ایسے security limbo میں پایا جس کا علاج دریافت کرنا انتہائی ضروری ہو گیا تھا۔ انقرہ یہ محسوس کرنے لگا کہ کمیونزم کے [بطور عالمی نظام] سقوط کے بعد ایک طرف تو مغرب کے ساتھ اس کے دفاعی اتحاد کی اہمیت ختم ہو گئی ہے اور دوسری طرف سابق سوویت بلاک کے مشرقی یورپی ممالک میں جمہوری حکومتوں کے قیام کی صورت میں مغرب اور موجودہ روسی فیڈریشن کے درمیان ایک "بفرزون" قائم ہو گیا ہے۔ جو مستقبل میں امکانی طور پر روس کی طرف سے توسیع پسندانہ پالیسیاں اختیار کرنے کی صورت میں بھی مغرب کے لیے ایک ڈھال کا کام دے گا[۱۶]۔ ترکی کی صورتحال یہ نہیں تھی۔ اس کی سرحدات پر واقع نو آزاد سابق سوویت جمہوریائیں سوویت یونین کے زوال سے بھی قبل سے آپس میں برسرپیکار تھیں اور ان تنازعات [جارجیا - ابخازیا تنازعہ اور آذربائیجان اور آرمینیا کے درمیان کاراباخ تنازعہ] میں روسی فیڈریشن کی براہ راست مداخلت کے باعث ان کے اثرات ترکی کی سلامتی کی صورتحال کو متاثر کرنے لگے تھے۔

انقرہ نے ان حالات میں اپنی خارجہ اور سلامتی سے متعلق پالیسیوں پر از سر نو غور کرنا شروع کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب انقرہ میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ترکی کے لیے سرد جنگ کے دوران اختیار کردہ

پالیسیوں پر مزید گامزن رہنا ممکن نہیں رہا ہے۔ دو قطبی نظام کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ سرد جنگ کے انداز سیاست کے تحت ترکی کو حاصل سلامتی اور استحکام کی چھتری اس کے سر سے سرکتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ابھی بدلتے ہوئے عالمی حالات میں ترکی کی خارجہ اور دفاعی پالیسیوں پر نظر ثانی کا عمل جاری تھا کہ ۱۹۹۱ء کے اواخر میں سابق سوویت یونین کی شکست و ریخت کے نتیجے میں وسطی ایشیاء اور قفقاز میں چھ نوآزاد مسلم جمہوریائیں عالمی نقشے پر ابھر کر سامنے آئیں۔ ترک پالیسی سازوں کے لیے یہ ایک 'welcome break' تھا۔ ترکی کے شمال مشرقی سرحدات پر ان جمہوریاؤں کے ظہور نے ترکی میں زبردست جوش و خروش پیدا کیا۔ ترکی کے ایک روزنامے "ملت" نے اس موقع پر لکھا:

> "It has been a great thrill for Turks to realize that they are no longer alone in the world."[17]

"ملت" کے اس comment سے جہاں نوآزاد ترک جمہوریاؤں کے ظہور پر ترک عوام کے خوشی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے وہیں اس سے اس "احساس تنہائی" و "بے مایگی" کا بھی پتہ چلتا ہے جو اس وقت مغرب کی طرف سے ترکی کے ساتھ روا رکھی جانی والی بے اعتنائی کے نتیجے میں ترک عوام اور پالیسی سازوں میں پائی جاتی تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء کے نصف آخر تک سرد جنگ کے خاتمے کے آثار کے ظہور کے دوران بھی ترکی نے مغرب سے مکمل وابستگی اور سوویت یونین کے ساتھ "ماسکو سنٹرڈ" تعلقات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی[۱۸]۔ اور کوئی ایسا عندیہ نہیں دیا کہ وہ بے صبری سے سوویت یونین کے خاتمے اور اس میں شامل ترک جمہوریاؤں کی آزادی کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن جب سوویت یونین کا انہدام ایک عالمی حقیقت بن کر سامنے آیا اور یونین کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھنے کی تمام کوششیں ناکامی کا شکار ہو گئیں تو انقرہ کو اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کے لیے ایک نیا محور مل گیا۔ ۱۹۹۱ء کے اواخر میں ترکی نے نوآزاد سابق سوویت جمہوریاؤں کے ساتھ تعلقات کے قیام کے لیے باقاعدہ اقدامات کیے۔ ترکی نے ۹ دسمبر ۱۹۹۱ء کو آذربائیجان اور ۱۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کو وسطی ایشیا کی دیگر چھ جمہوریاؤں کی آزادی کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا[۱۹]۔ جلد ہی سابق سوویت یونین میں شامل نو آزاد ترک جمہوریاؤں کے صدور کے انقرہ کے دوروں کا سلسلہ چل نکلا۔ ۲ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ترکمنستان کے صدر سپر مراد نیازوف انقرہ کے سرکاری دورے پر آئے۔ ۱۶ دسمبر کو ازبکستان کے صدر اسلام کریموف ترکی کے دورے پر آئے۔ اس کے ایک ہی ہفتہ بعد ۲۲ دسمبر کو کرغیزستان کے صدر عسکر اکیئیف انقرہ میں اپنے ترک بھائیوں سے مذاکرات کے لیے وارد ہوئے۔ اس سے قبل نومبر میں ایک اعلیٰ اختیاراتی آذری وفد نے انقرہ کا دورہ کیا تھا۔ فروری ۹۳ء تک ترکی اور وسطی ایشیاء اور قفقاز کی پانچ ترک ریاستوں [آذربائیجان، قازقستان، ازبکستان، ترکمنستان اور کرغیزستان] کے درمیان ایک سو چالیس

مختلف معاہدات پر دستخط ہو چکے تھے[20]۔

شروع شروع میں ترکی کی طرف سے وسطی ایشیائی ترک ریاستوں اور آذر بائیجان کے ساتھ تعلقات کے احیاء کے لیے نسلی، ثقافتی اور مذہبی ہم آہنگی کے حوالوں کو استعمال کیا گیا۔ چنانچہ مختلف حلقوں میں یہ محسوس کیا گیا کہ شاید ترکی سرکاری طور پر "پان ترکزم" کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ترکی میں "اڈریاٹک سے دیوار چین تک عظیم تر ترک بین الاقوامی برادری" کی باتیں عام ہونے لگیں۔ ترکی کے "علاقائی طاقت" بن کر ابھرنے کی باتیں بھی ترک اعلیٰ قیادت میں رواج پانے لگیں۔ ترک صدر ترگت اوزال نے یکم ستمبر ۱۹۹۱ء کو ترکش گرینڈ نیشنل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "سوویت یونین کے خاتمہ نے ترکی کو "علاقائی طاقت" بننے کا ایک تاریخی موقع مہیا کیا ہے"[21]۔ ترک وزیر اعظم سلیمان دیمرل نے وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ ترکی کے تاریخی رشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے "مشترک مذہب" کا بھی حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا:

> "We share a common history, a common language, a common religion and a common culture. We are cousins cut off from each other for over a hundred years, first by the Russians under the Czars, and then by the Communist regime."[22]

بہرحال جلد ہی وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ وسیع تر تعلقات کے قیام کے ضمن میں ترک پالیسی واضح تر ہونا شروع ہو گئی۔ ترکی ان جمہوریاؤں کے ساتھ بہتر تعلقات کے قیام کے ذریعے اقتصادی خوشحالی اور سیاسی استحکام کا خواہاں تھا۔ ترکی اس بات کا خواہش مند تھا کہ نو آزاد وسط ایشیائی ریاستیں اپنے سیاسی مستقبل کے تعین اور اپنی شناخت کی بازیافت کے عمل میں نیز بیرونی دنیا اور خاص کر مغرب کے ساتھ بہتر تعلقات کے قیام کی طرف پیش رفت میں ترکی کی پیروی کریں۔ شروع شروع میں روس نے بھی وسطی ایشیا میں ترک اثر و نفوذ کی حوصلہ افزائی کی۔ روسی وسط ایشیائی عوام میں بڑھتی ہوئی اسلامی بیداری کی لہر سے خوفزدہ تھے[23]۔ روسیوں کو خطرہ تھا کہ اسلامی بیداری کی یہ لہر روسی فیڈریشن کے اندر موجود مسلم قومیتوں کو ماسکو سے بغاوت پر اکسانے کا باعث بن سکتی ہے۔ روسی یہ سمجھتے تھے کہ اسلامی بیداری اور مسلم بنیاد پرستی پر قابو پانے کے لیے وسط ایشیائی ریاستوں میں ترکی کے اثر و نفوذ کو قبول کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ بصورت دیگر تہران کی اسلامی حکومت کو اپنا اسلامی انقلاب وسطی ایشیاء میں "برآمد" کرنے کے مواقع میسر ہو جائیں گے۔

مغرب اور امریکہ بھی یہی چاہتے تھے کہ وسط ایشیائی ریاستیں ترکی کی "سیکولر" طرز حکومت و معیشت اپنائیں۔ بش انتظامیہ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ ترکی کو وسطی ایشیاء میں اپنا سیاسی اور اقتصادی اثر و رسوخ بڑھانے میں ہر قسم کی امداد فراہم کی جائے۔ تاکہ ایران کو خطے میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے

سے روکا جائے۔ امریکہ اور مغرب میں ان خدشات کا برملا اظہار کیا گیا کہ کمیونزم کی ناکامی کے نتیجے میں پیدا شدہ نظریاتی خلا کو پُر کرنے کے لیے خطے میں "مسلم بنیاد پرستی" پوری قوت سے ابھر کر سامنے آ سکتی ہے جو ان کے نزدیک مغربی مفادات کے لیے نئے خطرات پیدا کرنے کا باعث ہوگی[24]۔ مسلم بنیاد پرستی کو "کاؤنٹر" کرنے کے لیے ترکی کو وسطی ایشیا میں قدم جمانے کے مواقع مہیا کرنا امریکی حکومت اور دیگر مغربی دارالحکومتوں کی پہلی ترجیح بن گئی[25]۔

اگرچہ کمیونزم کی ناکامی کے بعد "اسلامی بنیاد پرستی" کو مغرب نے اپنے نئے دشمن کے طور پر "شناخت" کر لیا ہے اور وسطی ایشیا میں اس نئے دشمن کی سرکوبی کے لیے اس نے ترکی کے سیکولر طرز حکومت و معیشت کو رواج دینا اپنے ایجنڈے میں شامل کر لیا ہے۔ لیکن بہرحال ترکی ایک مسلمان ملک ہونے کی حیثیت سے مغرب کے لیے کچھ زیادہ قابل اعتبار بھی نہیں ہے۔ بہرحال وہ خلافت عثمانیہ کا وارث ہے اور اس لحاظ سے اس سے یہ توقع رکھنا کہ مواقع دستیاب ہونے کے باوجود وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، مغرب کے لیے ناقابل یقین ہے۔ چنانچہ بعض مغربی حلقوں کی طرف سے برملا ان خدشات کا اظہار کیا گیا کہ ترکی ایک Commonwealth of Turkic Speaking World کے قیام کے پروگرام پر عمل پیرا ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف وہ ایک "آزاد علاقائی سپر پاور" بن کر سامنے آ سکتا ہے بلکہ مغرب مخالف پالیسیاں بھی اختیار کر سکتا ہے[26]۔

ترکی کی طرف سے وسط ایشیائی ریاستوں میں قدم جمانے کے لیے روسی مفادات کو نظر انداز کر کے جارحانہ اور دلیرانہ اقدامات نے ماسکو کو بتدریج یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ شاید خطے میں ترک اثر و نفوذ روسی مفادات کے لیے ایرانی اثر و نفوذ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ ایرانی وسط ایشیائی عوام کے ساتھ نسلی روابط نہیں رکھتے ہیں۔ ان کا [شیعہ] مذہب وسط ایشیائی عوام کے [سنی] مذہب سے مختلف ہے۔ چنانچہ روسی یہ سمجھنے لگے کہ وسط ایشیائی ریاستوں میں ایرانیوں کی سرگرمیاں نسبتاً غیر سیاسی نوعیت کی ہوں گی جن سے روسی مفادات پر زد نہیں پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۲ء کے بعد سے روسیوں نے ترکی کو یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ اسے روس کے ["near abroad" "قریبی بیرونی] میں روسی مفادات کے خلاف سرگرمیوں کی قطعاً اجازت نہیں دی جائے گی۔ روس کے لیے اگر وسطی ایشیا اور قفقاز میں "اسلامی بنیاد پرستی" اور احیاء اسلام کی تحریکیں ناقابل برداشت ہیں تو محض اس لیے کہ یہ روسی فیڈریشن میں شامل مسلم قومیتوں میں ماسکو سے بغاوت کے رجحانات کے ظہور کا سبب بن سکتی ہیں۔ بالکل اسی منطق کے مطابق خطے میں اگر ترکی کی آزادانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں "پان ترکزم" کے جذبات کو تقویت ملتی ہے تو یہ بھی مذہبی بنیادوں پر نہ سہی نسلی بنیادوں پر روسی فیڈریشن میں شامل ترک مسلم قومیتوں کو ماسکو کے خلاف بغاوت پر اکسانے کا باعث بن سکتے ہیں۔

دوسری طرف مغرب اور روس کے مابین سرد جنگ کے خاتمے کے بعد "پارٹنر شپ فار پیس پروگرام" کے ضمن میں روس کے "نیرا بروڈ" میں اس کے حق "مداخلت وامن سازی" کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مغرب میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ مستقبل میں مغرب، امریکہ اور روس کی بالادستی کے لیے چیلنج اور خطرات ایشیائی (بشمول مسلمان) ممالک کی طرف سے درپیش ہوں گے۔ اور ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے روس جیسے بڑے ملک کا بطور حلیف مغرب کے ساتھ اشتراک کار انتہائی ضروری ہوگا:

> "The justification for such a partnership is twofold. First as indicated earlier, the probable threats in the next century will come from large Asian countries with nuclear weapons, where ethnic, economic and political turmoil may bring populist leaders such as Hitler, Mussolini, or Juan Peron (perhaps in religious form, like the Ayatullah Khomeini) to power. Russia with its 150 million people__ one could even say the former Soviet Union with its 300 million __ borders on major Asian countries. ... By the same token, if threatening leaders ever come to power in any of the large countries of Asia, the West has a vital interest in having a front-line ally of Russia's size.. Indeed, the knowledge that Russia and the West are in partnership may deter the rise of future Saddam Husseins." [27]

۱۹۹۳ء میں نگورنو کاراباخ کے مسئلہ پر آرمینیا اور آذربائیجان کی جنگ میں شدت آنے پر جب ترکی نے آذربائیجان کی امداد کے لیے مداخلت کا ارادہ ظاہر کیا تو روسیوں نے انتہائی سخت زبان استعمال کرتے ہوئے ترکی کو خبردار کیا:

> "کسی بھی تیسرے ملک کی طرف سے تنازعہ میں فوجی مداخلت تیسری عالمی جنگ کے آغاز کا سبب بن سکتی ہے۔" [۲۸]

انقرہ میں ماسکو کے اس شدید ردعمل کو انتہائی سنجیدگی سے لیا گیا۔ اور ازاں بعد سابق سوویت یونین کی ترک جمہوریاؤں کے بارے میں ترک خارجہ پالیسی میں ایک بار پھر تبدیلی کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو گئے۔ ترکی نے سمجھ لیا کہ ان جمہوریاؤں کے ساتھ اقتصادی شعبوں میں تعاون تو اگرچہ فریقین کی ضرورت ہے لیکن ان تعلقات کو سیاسی اور دفاعی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے ترکی نے "علاقائی سپر پاور" بننے کے جو خواب دیکھے تھے ان کی تکمیل نہ صرف روس بلکہ خود انقرہ کے مغربی حلفاء کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ آذربائیجان کو روس کے زیر اثر "CIS" میں شامل ہونے اور

آذری علاقوں میں روسی امن افواج کی deployment قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لیے جس طریقے سے آرمینیا کی فوجی اور مالی مدد کی گئی اور کارا باخ، انجازیا اور چیچنیا کے تنازعات کے علاوہ بلقان [بوسنیا کی "خانہ جنگی"] میں جس طریقے سے انقرہ کے کردار کی نہ صرف روس بلکہ بین الاقوامی برادری اور "انقرہ کے حلفاء" کی طرف سے نفی کی گئی، اس سے انقرہ کے حکمرانوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان کے لیے ان کے عثمانی اور اسلامی ماضی سے اپنے آپ کو isolate کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ اگر وسط ایشیائی نوآزاد ممالک میں اسلامی تحریکات اور اسلامی بنیاد پرستی کو علاقے میں "عدم استحکام" برپا کرنے سے روکنے کے لیے کسی "ایکٹر" کی ضرورت ہے تو مغرب اور امریکہ کے لیے اس سلسلے میں ترکی کی افادیت "محدود" ہے:

> "Even in Turkey one can easily say that, at best, it is an example of a secular government that is presiding over a Muslim society."[29]

انقرہ کے ساتھ مغرب کے اس منافقانہ رویّے کا ایک مظہر یہ ہے کہ وہ ترکی کو وسط ایشیائی ریاستوں کے لیے مغرب کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے قیام کے لیے بطور ماڈل پیش کر رہا ہے لیکن خود ترکی کو مغرب کی سیاسی اور اقتصادی تنظیموں میں مکمل ممبر شپ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت وسط ایشیائی ریاستوں کے حکمرانوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جہاں تک وسط ایشیائی ریاستوں کا تعلق ہے وہ اگرچہ اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کے لیے ترکی کے ساتھ ہمہ جہتی تعلقات کے دائرہ کار میں توسیع کے لیے سرگرم ہیں لیکن یوں لگتا ہے وہ کسی بھی "ماڈل" کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے کے بجائے تمام options کھلے رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف ترکی کو بھی نام نہاد "new Great Game" میں شامل دیگر پڑوسی اسلامی ممالک کی طرح اپنی محدود صلاحیتوں کا احساس ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۳ء کے بعد سے وہ اس گیم کے "فاتح" ماسکو کو ناراض کرنے کی پالیسیاں ترک کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ وسط ایشیا میں اس کی روزافزوں سرگرمیوں کا اس وقت واحد محور اقتصادی شعبوں میں پیش رفت کا حصول ہے۔

وسطی ایشیا میں سوویت یونین کے زوال کے بعد اگر کسی "new Great Game" کا آغاز ہوا بھی تو اس "گیم" کے "ونرز" (فاتحین) کا فیصلہ کب کا ہو چکا ہے۔ چنانچہ ترکی، ایران، پاکستان اور سعودی عرب سمیت دیگر مسلمان ممالک کی ان جمہوریاؤں میں حالیہ سرگرمیوں کا تجزیہ اس نام نہاد "گریٹ گیم" کے فریم ورک میں کرنا درست نہیں ہے۔

حواشی

1. Bahri Yilmaz, "Turkey's New Role in International Politics", *AUSSEN Politics*, no 1, 1994.
2. Rubab Hasan, "Turkey _ Central Asian Ties", in Moonis Ahmar (ed), *Contemporary Central Asia*, Karachi, 1995, p. 244.
3. Diden Mersin Alici, "The Role of Culture, History and Language in Turkish National Identity Building: An Over-emphasis on Central Asian Roots", *Central Asian Survey* , no. 2, vol. 15, 1996.
4. Ibid.
5. Ibid. [quoting Anthony D. Smith, *National Identity* (London: Penguin. 1991). p. 19.]
6. Ibid.
7. Oral Sander, "Turkey And The Turkic World", *Central Asian Survey* , no. 1, vol. 13, 1994.
8. Mustafa Aydin, "Turkey and Central Asia: Challenges of Change", *Central Asian Survey* , no. 2, vol. 15, 1996.
9. Ibid.
10. Bahri Yilmaz, op cit.
11. Ibid.
12. Ibid.
13. Ibid.
14. Ibid.
15. Ibid.
16. Mustafa Aydin, op cit.
17. Ibid.

۱۸- اس دوران جون ۱۹۹۰ء سے لے کر نومبر ۱۹۹۰ء تک کے عرصے میں وسط ایشیائی ریاستیں یکے بعد دیگرے اپنے اقتدارِ اعلیٰ sovereignty کا اعلان کر چکی تھیں۔ تاہم یونین سے مکمل علیحدگی کا اعلان ابھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہی وہ عرصہ ہے جس کے دوران متعدّد ممالک کی طرف سے ان جمہوریاؤں کے ساتھ تعلقات کے قیام کے لیے متعدد اقدامات اٹھائے گئے۔ ترکی نے بھی اس عرصے میں ان جمہوریاؤں کے ساتھ متعدد سمجھوتوں پر دستخط کیے تاہم اس نے ان سمجھوتوں پر ماسکو کی مرکزی حکومت کے توسط سے دستخط کیے۔ (دیکھیے - مصطفیٰ ایدین بحوالہ بالافٹ نوٹ نمبر ۱۴)

19. Ibid, (footnote no. 14).
20. Ibid, (footnote no. 15).
21. Ibid, (footnote no. 5).
22. Mushahid Hussain, "Iran and Turkey in Cantral Asia:

Complementary or Competing Roles?", *Middle East International,* 19 Feb. 1993.
23. Mustaf Aydin, op cit.
24. Ibid.
25. M.E. Ahrari, "The Dynamics of New Great Game in Muslim Central Asia", *Central Asian Survey,* no. 4 vol. 13, 1994.
26. Oral Sander, op cit.
27. Jerry F. Hough, "America's Rusia Policy: The Triumph of Neglect", *Current History,* Oct. 1994.
28. Bruce Vaughin, "Shifting Geopolitical Realities Between South, Southeast and Central Asia", *Central Asian Survey,* no. 2. vol. 13, 1994.
29. M.E. Ahrari, op cit.

وسطی ایشیا: خارجہ تعلقات

کرغیزستان: جمہوریت اور امریکی سرپرستی

مغربی حلقوں میں وسطی ایشیا کی سابق سوویت جمہوریاؤں میں کرغیزستان سب سے زیادہ جمہوری رجحانات کی حامل ریاست تصوّر کی جاتی ہے۔ گو انسانی حقوق اور آزادیٔ اظہار رائے کے حوالے سے کرغیزستان کا ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔ کرغیزستان پر چھپنے والی رپورٹوں میں کہا گیا ہے کہ صدر عسکر اکئیف کی حکومت پر تنقید کرنے والے ذرائع ابلاغ سے وابستہ افراد اور اپوزیشن کے ارکان کو نہ صرف ہراساں کیا جاتا ہے بلکہ انہیں قید و بند کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اگرچہ کرغیز آئین میں شہریوں کو نمایاں حقوق دینے کا وعدہ کیا گیا ہے اور ملک کو "جمہوریت" قرار دیا گیا ہے تاہم اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ ملکی پالیسیاں صدر اکئیف خود ہی تشکیل دیتے ہیں۔ ملک کا عدالتی نظام انتظامیہ کے تابع ہے۔ حکومت جسے چاہتی ہے حراست میں لیتی ہے، جسے چاہتی ہے پس زنداں بھیج دیتی ہے اور جسے چاہتی ہے سزا کا مستحق ٹھہراتی ہے۔ مقامی اخبارات نے - جن پر حکومت کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں ہے - پولیس کے وحشیانہ مظالم کی متعدد مثالیں نقل کی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔

اس کے باوجود امریکی حکومت کا خیال ہے کہ جمہوریہ کرغیزستان وسط ایشیائی خطے کی سلامتی اور